



رتن سنگھ

(پیدائش : 1927)

رتن سنگھ ضلع سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ وہیں انھوں نے تعلیم حاصل کی۔ بعد میں دہلی چلے آئے اور کچھ عرصہ لکھنؤ میں رہے۔ ان کی پہلی کہانی ”مٹی تم ایک دیوار ہو“ 1953 میں شائع ہوئی۔ 1969 میں ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ”پہلی آواز“ منظر عام پر آیا۔ اس کے بعد ان کے کئی افسانوی مجموعے شائع ہوئے جن میں ”پنجرے کا آدمی“، ”مانک موتی“ اور ”کاٹھ کا گھوڑا“ شامل ہیں۔ ”صبح کی پری“ بچوں کی کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ انھوں نے اردو میں بعض پنجابی افسانوں اور ناولوں کے ترجمے بھی کیے۔ رتن سنگھ کا تعلق بھی ادیبوں کی اس نسل سے ہے جو ترقی پسند تحریک کے ساتھ ذہنی اور نظریاتی وابستگی رکھتے تھے۔ ان دنوں رتن سنگھ کا مستقل قیام نویڈا (گوتم بدھ نگر) میں ہے۔



5019CH08

من کا طوطا

ایک دن یہ ہوا کہ میرے من کا طوطا پھدک کر میرے جسم سے باہر آ گیا اور میرے سامنے تپائی پر بیٹھ گیا۔

”یہ کیا بھائی؟ باہر کیوں آ گئے؟“ میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

”جسم کے اندر پڑا پڑا میں بڑی گھٹن محسوس کر رہا تھا، اس لیے سوچا کہ ذرا باہر کی ہوا کھائی جائے۔“ یہ کہتے ہوئے وہ تپائی

سے اُڑا اور بڑی میز پر جا کر کتابوں کے اوپر بیٹھ گیا اور ایک کتاب کو چونچ مار کر اُس نے کھول دیا۔

”ارے ارے کیا کرتے ہو؟ کتاب ہے پھٹ جائے گی۔“

”پھٹ جائے تو اچھا ہے، انھیں پڑھ کر ہی تو تم مجھے اپنی مرضی نہیں کرنے دیتے۔ اچھا ہے، یہ بُرا ہے، یہ ٹھیک ہے، یہ

ٹھیک نہیں ہے.....“

”ٹھیک ہی کہتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

طوطے نے میری بات اُن سنی کرتے ہوئے

اُڑان بھری اور ایک پہاڑ کی تصویر کے چوکھٹے پر جا کر

بیٹھ گیا۔ اُس میں ایک پہاڑی ندی پتھروں کے بیچ بہتی

ہوئی بہت بھلی لگ رہی تھی۔ کچھ دیر وہ ندی کی طرف

دیکھتا رہا اور پھر بولا ”جس طرح یہ ندی کا پانی پہاڑوں

کے گھیرے میں بند ہو کر نہیں رہ سکتا اسی طرح مجھ سے

بھی اب تمہارے اندر نہیں رہا جاتا۔“

”لیکن کیوں؟“

”اس لیے کہ میں نے ایک زندگی تمہارے



ساتھ گزار کر دیکھ لی، تمہارے ساتھ رہ کر میری تو ایک بھی خواہش پوری نہیں ہوئی۔“
 ”لیکن بھائی میں وہی تو کرتا ہوں جو میں اپنی عقل کے مطابق ٹھیک سمجھتا ہوں؟“
 ”تمہاری عقل کی دنیا اتنی چھوٹی ہے کہ میرا اس میں دم گھٹنے لگا ہے۔“ یہ کہتے ہوئے من کا طوطا تصویر سے اڑا اور باہر کی طرف گھٹنے والی کھڑکی پر آ کر بیٹھ گیا۔

کھلی ہوئی کھڑکی کی روشنی میں میں نے اپنے من کے طوطے کی طرف غور سے دیکھا مجھے بڑا ہی خوب صورت لگا۔ گلے میں گہری نیلے رنگ کی گانی، سرخ چونچ، ہرے ہرے پنکھ جیسے.....
 ”کیا دیکھ رہے ہو؟“ من کے طوطے نے پوچھا۔

”یہی کہ تم بہت خوب صورت ہو۔“
 ”اور آج میرا من دنیا کی خوب صورتی دیکھنے کے لیے چل رہا ہے۔“ یہ کہتے ہوئے اُس نے اُڑنے کے لیے پنکھ تولے۔
 ”ارے ارے کہاں جاتے ہو؟“

”میں شام تک لوٹ آؤں گا“ یہ کہتے ہوئے میرے من کے طوطے نے اُڑاں بھری اور آنکھ جھپکتے میں آسمان کی گھلی فضاؤں میں پہنچ گیا۔

یوں تو من کا طوطا کبھی بھی میرے قابو میں نہیں رہا۔ تصوّر ہی تصوّر میں یہ اُن دیکھی، اُن جانی وادیوں میں بھٹکتا رہتا تھا۔ کبھی گھنے جنگلوں کے سائے میں بھٹکتا پھرتا تو کبھی سائبیریا کے بریلے علاقے میں پہنچ جاتا، کبھی پتے ہوئے ریگستان میں سے گزر کر اسی نخلستان کے ٹھنڈے میٹھے سائے میں جا کر لیٹا رہتا، تو کبھی کسی پہاڑی ندی کے کنارے بیٹھ کر پانی کی مدھر قل کو سنتا رہتا۔ یہاں تک کہ کبھی کبھی تو اندر بھگوان کی نگری میں پہنچ کر کسی سروور کے صاف شفاف پانی میں اٹھکھیلیاں کرتا رہتا۔ لیکن یہ سب تصوّر ہی تصوّر میں ہوتا تھا، تصوّر ہی تصوّر میں یہ کئی قسم کے انوکھے چہرے میرے سامنے لا کر کھڑا کر دیتا۔

”یہ کون ہیں؟“ میں ٹوکتا۔

”یہ تمہارے تخیل کی اُچھ ہیں۔“ من کا طوطا کہتا۔

”میرا تخیل یا تمہارا اپنا فتور؟“

”کچھ بھی سمجھو، زندگی میں تمہارا ان سب سے رشتہ ہے۔“

”نہیں، یہ میرے کچھ نہیں لگتے۔“

”کیا تم خدا کی کائنات سے باہر ہو؟“ من کا طوطا پوچھتا۔

”باہر تو نہیں ہوں، لیکن میں ان کو نہیں جانتا۔“

”اگر کائنات کے بھید جاننا چاہتے ہو تو ان سب کو دیکھو، جو میں نہیں دکھا رہا ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے وہ ایک نیا چہرہ میرے سامنے لا کر کھڑا کر دیتا۔ یا پھر آن کی آن میں کسی انجانے دلش کے انجانے شہر میں کسی پُل پر کھڑا ہو کر نیچے بہتے ہوئے دریا کا نظارہ دیکھنے میں محو ہو جاتا۔

یہ سب تو اکثر ہوتا تھا۔ لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا جیسا اُس دن ہوا کہ وہ بذاتِ خود میرے وجود سے باہر نکل آیا اور اب پتا نہیں خدا کی کائنات میں کہاں بھٹک رہا تھا۔

اُس دن میں سارا دن پریشان رہا۔

اسی پریشانی کے عالم میں کہیں آنکھ لگ گئی تو کندھے کے نیچے میرے بازو پر پتہ نہیں کسی چیز نے کاٹ لیا۔ میرے گھر میں چوہے بہت ہیں، ادھر ادھر بھی گھومتے رہتے ہیں اور پھر کوڑھ کر لیاں بھی ہیں۔ پتہ نہیں کس نے مجھے بے سدھ پا کر کاٹ لیا تھا۔ پٹی کر دینے سے لہو بہنا تو بند ہو گیا تھا مگر بازوؤں میں درد کافی ہوتا رہا۔

اسی پریشانی میں کسی نہ کسی طرح شام ہو گئی۔ بازو کے درد سے زیادہ مجھے من کے طوطے کی فکر تھی، اسی لیے آسمان کی طرف آنکھیں جمائے بیٹھا تھا۔ تبھی میرے من کا طوطا دھیرے دھیرے اُڑتا ہوا آیا اور کھڑکی کے راستے سے کمرے میں داخل ہو کر تپائی پر بیٹھ گیا۔

میں نے دیکھا اُس کا حلیہ بے رنگ ہو رہا تھا، پنکھ نچے ہوئے تھے، چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔

”کہو کیسی بیتی؟“ میں نے اسے دلا سہ دیتے ہوئے تپائی سے اٹھا کر ہاتھ کی ہتھیلی پر بٹھا لیا۔

کچھ دیر تک وہ اپنی سانس قابو میں کرتا رہا۔ جب اس کا دم میں دم آیا تو بولا ”آج میرے ساتھ بہت بُرا ہوا“ اور پھر اُس نے اپنی کہانی سُنائی شروع کی۔

”میں یہاں سے اُڑا تو بہت دور ایک بہت بڑے پیڑوں کے جھنڈ میں اترا، وہاں طرح طرح کے پکشی چمک رہے تھے۔ وہاں اپنے بھائی بندوں کے بیچ پہنچ کر مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ جس پیڑ پر میں اترا تھا وہ بھی بڑا سندر تھا۔ جسم میں کچھ ٹھنڈک آئی تو میں نے چاروں طرف دیکھا۔ کبوتر، کوئے، مینا، چڑیا سبھی پُھدک رہے تھے۔ تبھی میں نے ایک ٹہنی پر طوطوں کی ایک ٹولی دیکھی۔ ان میں ایک طوطی مجھے بہت اچھی لگی۔ میرے من میں آیا کہ اس طوطی کے پاس چل کر بیٹھتا ہوں، کچھ من بہل جائے گا۔ ابھی میں

اُس کے پاس جانے کی بات سوچ ہی رہا تھا کہ ایک طوطے کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔ پہلے تو وہ کچھ دیر مجھے گھور گھور کر دیکھتا رہا، مگر پھر اس نے ایسی ٹیٹیں شروع کی کہ اس کے ساتھ مل کر باقی طوطے بھی ٹیٹیں کرنے لگے۔ میری سمجھ میں ہی نہ آیا کہ ماجرا کیا ہے۔ اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ وہ سبھی طوطے ایک ساتھ وہاں سے اُڑے اور میری طرف چھپے، ان سے گھبرا کر میں ایسا دم دبا کر اڑا ہوں کہ کچھ پوچھو نہیں۔“

”اور ان طوطوں نے تمہارا پیچھا چھوڑ دیا؟“

”مجھ سے تیز بھلا اس دنیا میں کون اُڑ سکتا ہے، پیچھا نہ چھوڑتے تو کیا کرتے۔ مگر تم بچ میں ٹوک نہیں“ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی روداد پھر سنائی شروع کی:

”اب میں پیڑوں کے اُس ٹھنڈ سے اُڑا تو اُڑتے اُڑتے ایک دریا کے کنارے پہنچا۔ وہاں ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی، اس لیے میں کتنی دیر تک دریا کے ساتھ ساتھ اُڑتا رہا، بڑا مزہ آیا۔ آگے گیا تو دریا کے کنارے ایک بڑا ہی خوب صورت سا پیڑ اُگا ہوا دکھائی دیا۔ اس پر لگے ہوئے پھولوں سے بڑی بھینی بھینی خوش بو آرہی تھی۔ دور سے پھول ایسے لگ رہے تھے جیسے آسمان کے ستارے پیڑ پر بیٹھ کر دریا کے بہتے ہوئے پانی کو دیکھ کر من بہلا رہے ہوں۔“

میں جلدی جلدی پنکھ مارتا ہوا جب اُس پیڑ کے قریب پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ اس پیڑ کے نیچے ایک بہت ہی خوبصورت عورت گہرے آسمانی رنگ کی ساڑی پہنے اپنے دھیان میں مگن دریا کی لہروں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی میں جلدی سے زمین پر اُترا اور طوطے کا جامہ چھوڑ کر انسانی جامہ پہن لیا اور اپنے ذہن میں بہت سے حسین سپنے بُنتا ہوا اُس پیڑ کی طرف چلنے لگا۔ ابھی میں اُس سے دس پندرہ قدم دوری پر ہی تھا کہ اس عورت کی باندی نے میرا راستہ روک دیا۔“

”مالکن کے پاس جانے کی کسی کو اجازت نہیں۔“

”کیوں، کیا بات ہے؟“

”دیکھتے نہیں، وہ اپنے محبوب کی یاد میں کس طرح ڈوبی ہوئی ہیں۔“

”کون ہے ان کا محبوب؟“ میں نے بے چین ہو کر پوچھا۔

”دیکھا تو اس کو انھوں نے بھی نہیں، بس ایک بار سپنے میں آیا تھا۔“

”ہو سکتا ہے وہ میں ہی ہوں، ہو سکتا ہے وہ میری ہی باٹ دیکھ رہی ہوں۔ میں بھی ایسے سپنے بہت دیکھتا ہوں“ یہ کہتے

ہوئے میں نے آگے قدم بڑھانا چاہا تو اونچے پھن لہراتے ہوئے دو سانپوں نے میرا راستہ روک دیا۔

میں نے ڈر کر جھٹ سے اپنا قدم واپس لے لیا تو وہ سانپ بھی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔
 ”میری مالکن کے پاس جا کر قسمت آزمانا چاہتے ہو تو پہلے تمہیں اس بستی میں جانا ہوگا۔“ باندی نے دریا سے تھوڑا ہٹ کر
 بسی ہوئی ایک بستی کی طرف اشارہ کیا۔ وہاں ہاٹ لگی ہوئی ہے، ہیرے موتی یک رہے ہیں، چمکتے دسکتے زیور یک رہے ہیں،
 خوب صورت مکان یک رہے ہیں، یہ سب خرید کر آؤ تو تمہیں چند قدم دریا کے کنارے چلتے ہوئے مالکن سے بات کرنے کا موقع
 مل جائے گا۔ اور اب جو میں کہہ رہی ہوں اُسے دھیان سے سنو۔ اگر دریا کے کنارے چلتے ہوئے ریت پر بننے والے تمہارے
 پاؤں کے نشان پانی کی لہروں سے مٹے نہیں تو مالکن سمجھ جائے گی کہ تم ہی اس کے سپنے والے محبوب ہو۔“

”یہ پاؤں کے نشان نہ مٹنے کا کیا راز ہے؟“

”کوئی راز نہیں، سپنے میں جو محبوب اس کے پاس آیا تھا، اُس نے اپنی یہی نشانی بتائی تھی۔“

”یہ کہ دریا کے کنارے جب وہ مالکن کے ساتھ چلے گا تو اس کے پاؤں کے نشان مٹیں گے نہیں؟“
 ”ہاں“

میں نے ایک نظر بھر کر مالکن کی طرف دیکھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے میدکا اور اروشی اندر کا دربار چھوڑ کر اس دھرتی پر آگئی ہوں، یا
 پھر وہ اسی دھرتی کا سب سے خوب صورت پھول تھی۔

مجھے اُس کی خوب صورتی میں گم ہو کر بُت بننے دیکھ کر اس کی باندی نے جھنجھوڑا ”اگر تمہیں کوشش کرنی ہے تو جلدی جاؤ، تم
 سے پہلے بھی کئی لوگ جا چکے ہیں۔ اگر وہ سب کچھ حاصل کر کے پہلے لوٹ آئے تو تم ہاتھ ملتے رہ جاؤ گے۔“
 میں نے سوچا قسمت آزمانے میں کوئی حرج نہیں اور فوراً چل دیا۔

جب میں اس بستی میں پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ بازار میں بڑی گہما گہمی ہے۔ پہلی ہی ہاٹ پر ہیرے، موتی اور سونے کے
 سکوں کا بہت بڑا ڈھیر لگا ہوا تھا اور اس کا مالک ایک ایسا آدمی تھا جس کی گردن کے اوپر آدمی کے سر کے بجائے سانپ کا بھن لہرا
 رہا تھا۔

”یہ دھن دولت کا ڈھیر کتنے کا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”دھن دولت کی قیمت دھن تو ہو ہی نہیں سکتا۔“ دوکان دار نے اپنی دو پھاڑ زبان کو لہراتے ہوئے کہا۔

”تو پھر یہ کیسے مل سکتا ہے؟“

”مل سکتا ہے، بڑی آسانی سے مل سکتا ہے۔“

”بتاؤ تو کیسے؟“

”صرف ایک بار اپنے بازو پر مجھے کاٹ لینے دو، یہ ساری دولت تمھاری ہو جائے گی۔“

سانپ کے کاٹنے سے مجھے درد تو بہت ہوا لیکن میں نے وہ دولت کا ڈھیر حاصل کر لیا۔

اس کے ساتھ ہی ایک آدمی کہ جس کا چہرہ جو تک جیسا تھا، زیور بیچ رہا تھا۔ اس کی شرط یہ تھی کہ جو بھی اسے ایک بار پیٹ بھر خون چوس لینے دے گا، اسے وہ سارے زیور دے دے گا۔

میں نے جلدی سے جو تک سے اسی جگہ سے خون چسوا لیا جہاں سانپ نے کاٹا تھا اور اس طرح میں نے سارے زیور حاصل کر لیے۔ اب مکان کی کسر رہ گئی تھی۔ اتفاق سے اگلا دوکان دار مکان ہی بیچ رہا تھا۔ جب وہ مجھے اپنا مکان دکھا رہا تھا تو اس کے چہرے پر کوئل کا چہرہ تھا اور اس کی آواز بڑی سریلی اور میٹھی تھی۔ لیکن جب مکان مجھے ہر لحاظ سے پسند آ گیا اور دام طے کرنے کی نوبت آئی تو اس دوکان دار نے اپنی گردن سے کوئل کا چہرہ اُتار کر اس پر عقاب کا چہرہ لگا لیا۔ اُف کتنی بھیانک تھی اس کی وہ شکل، اس کی گول گول آنکھوں میں تو جیسے خون اُتر آیا تھا۔

وہ بولا ”یہ دھن دولت اور زیور سب کچھ ایک طرف رکھ دو اور آسمان پر اڑتے ہوئے ان پکشیوں کو گنو۔ اگر تم نے صحیح گن دیا تو مکان کے ساتھ ساتھ روپیہ پیسہ اور زیور سب کچھ تمھارا ہو جائے گا۔ لیکن اگر گنتی غلط ہوگئی تو مکان تو ملے گا نہیں، اپنے دھن دولت سے بھی ہاتھ دھونا پڑے گا۔“

میں نے اس کی شرط مان لی اور پکشی گن کر کہا ”بیس۔“

”نہیں، اکیس۔ اور اس نے مجھے اکیس پکشی گنوا کر میرا سارا دھن دولت سمیٹ لیا۔“

اس طرح میں نے پانچ بار سانپ کو کوٹوا یا، پانچ بار جو تک سے لہو چسوا یا۔ لیکن ہر بار یہ ہوتا کہ پکشی گنتے وقت مجھ سے غلطی ہو جاتی۔ میں گنتا اکیس تو پکشی بائیس نکلتے، میں کہتا تینیس تو پکشی چوبیس نکلتے۔

آخر چھٹی بار مکان کے مالک کو مجھ پر ترس آ گیا، ویسے بھی وہ اپنے مکان کے پانچ گنا دام تو مجھ سے وصول کر ہی چکا تھا، اس لیے اس نے کہا ”تیرا عشق سچا ہے تیری ضرورت بھی بڑی ہے، اس لیے پکشی گنے بغیر ہی میں مکان تم کو دیتا ہوں۔“

بس پھر کیا تھا میں اپنا دھن دولت اور زیور اس مکان میں رکھ کر اُلٹے پاؤں دریا کے کنارے پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ نہ تو وہ پھولوں سے لدا پیڑ ہی مجھے دکھائی دیا اور نہ ہی وہ پھول سی عورت ہی وہاں موجود تھی۔

جہاں تک میری نظر جاتی تھی دریا کا پانی تھا جو قل قل کرتا ہوا حد نظر تک بہتا چلا جا رہا تھا۔ میں بہت دیر تک وہاں مایوس سا

کھڑا رہا۔

آخر سوچا واپس ہی چلوں۔

تبھی دریا کے کنارے پر میری نظر گئی۔ کسی کے پاؤں کے گہرے نشان بستی کی طرف جاتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔
”تو اس عورت کو اس کا محبوب مل گیا۔“ میں نے سوچا۔

میری نظر ان قدموں کے نشانوں کا پیچھا کرتی ہوئی بستی کی طرف اٹھی تو مجھے لگا جیسے میرے پاؤں کے نیچے سے زمین کھسکتی جا رہی ہو۔

دور دور تک کسی بستی کے کوئی آثار نہیں تھے۔ بس ایک چٹیل میدان تھا جو اُفق تا اُفق پھیلتا چلا گیا تھا۔
اب حیران ہو کر یہ دیکھتا ہوں کہ میرے پاؤں کے نیچے زمین بھی ہے یا نہیں تو پایا کہ زمین تو ہے مگر وہ دریا اور اس کا قل قل کرتا پانی غائب ہے۔

میں کسی جادوگری میں پہنچ گیا ہوں۔ میں نے سوچا اور گھبرا کر جلدی سے اپنے انسانی جامے کو وہیں چھوڑا۔ پھر وہی من کا طوطا بن کر اڑاں بھری، اب تمہارے پاس آ گیا ہوں۔“

میرے من کے طوطے کی کہانی ختم ہو گئی تو اس نے اپنی گردن یوں نیچے ڈال دی جیسے بہت تھک گیا ہو۔
ایک ہی ہتھیلی پر اسے بٹھائے ہوئے میرا بازو بھی تھک گیا تھا، اس لیے میں اسے دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی پر بٹھانے لگا تو بازو میں درد کے مارے میری چیخ نکل گئی۔

”کیوں کیا ہوا؟“ اس نے گھبرا کر پوچھا۔

”جہاں تم نے سانپ سے کٹوایا تھا وہاں درد ہو رہا ہے۔“

”تب تو بہت سا خون بھی شریر سے نکل گیا ہوگا؟“

”ہاں، چونک چھ چھ بار چوسے گی تو وہ کچھ تو ہوگا ہی۔“

”مجھے واقعی بڑی شرمندگی ہے،“ من کے طوطے نے کہا، اور اس نے ایک مرتبہ پھر گردن نیچے ڈال دی۔

”تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔“ میں نے اسے ڈھارس بندھاتے ہوئے کہا۔

”ہاں ہے تو“ یہ کہتے ہوئے من کا طوطا فوراً جسم میں داخل ہو گیا۔

اگلے دن صبح ہوئی تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہ پھر پہلے کی طرح نوبہ نو، تازہ بہ تازہ میرے جسم سے نکل کر میرے سامنے تپائی پر

بیٹھ گیا، پھر اسی طرح پُھدکتا ہوا پہاڑ کی تصویر کے پاس گیا اور پھر وہاں سے مجھے کچھ کہے بغیر کھڑکی کے راستے باہر نکل گیا۔
تب سے میرے من کے طوطے کا یہی حال ہے۔ پتہ نہیں زندگی کی کون کون سی کششیں ہیں جو میرے من کے طوطے کو اپنی
طرف بلاتی ہیں، پتہ نہیں کیسے کیسے بیٹھے سنے اپنے دل میں سموئے ہشاش بشاش وہ گھر سے روز نکلتا ہے اور ہر شام تھکا ہارا، مایوس
اور اُداس واپس لوٹ آتا ہے۔
اپنے من کے طوطے کی نئی درد بھری داستان سننے کے لیے میں ہر شام تیار رہتا ہوں۔

_____ رتن سنگھ

سوالوں کے جواب لکھیے:

- 1- مصنف نے ”من کا طوطا“ سے کیا مراد لی ہے؟
- 2- ”تمھاری عقل کی دنیا اتنی چھوٹی ہے کہ میرا اس میں دم گھٹنے لگا ہے“ طوطے نے ایسا کیوں کہا؟
- 3- ہر شام مایوس لوٹنے کے بعد بھی من کا طوطا ہر صبح گھر سے کیوں نکل جاتا ہے؟

